رخصت و عزیمت

خرم مرادؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رخصت وعزیمت

رخصت وعزیمت خاصا مشکل موضوع ہے۔اس لیے کہ رخصت وعزیمت کا معاملہ اس طرح واضح اور متعین نہیں ہے، جس طرح کہ حلال وحرام واضح اور متعین ہیں، بلکہ یہ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع میدان ہے، جس کا تعین ترجیحات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اگر رخصت کا پہلو لیا جائے تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ دور دین پر چلنے کے لیے ایسا دور ہے، جس کے بارے میں وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم صادق آتی ہے کہ

جب کسی ایک حکم پر عمل کرنا، اپنے ہاتھ میں آگ کا انگارہ پکڑنے کے مترادف ہوگا۔ دوسری طرف وہ بہت ساری احادیث ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ آسانی پیدا کرو، سختی نہ کرو (یسروا ولا تعسروا)، یا یہ فرمایا گیا ہے کہ دین آسان ہے (الدین یسر)۔ اسی طرح قرآن کی وہ آیتیں بھی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کے لیے اتاری ہیں، ان کو حرام کرنے والا کون ہے۔ اب جب کہ اللہ کے دین پر چلنا ایسا ہے جیسا کہ کانٹوں پر چلنا، اور اس کے احکام پر عمل کرنا اس طرح ہے جیسا کہ اپنے ہاتھ میں انگارہ پکڑ لینا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ساری واضح ہدایات موجود ہیں، جن میں کہا گیا کہ دین آسان ہے اور آسانی پیدا کرو، تو خیال آتا ہے کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ لوگوں کو اس راستے کی طرف بلایا جائے جو کہ آسانی کا راستہ ہو اور جس پر چل کر آسانی کے ساتھ اللہ کے دین کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔

دوسری طرف اگر عزیمت کا پہلو لیا جائے تو خیال آتا ہے کہ ہمارا گروہ تو ایک ایسا گروہ ہے، جو وہ کام کرنے چلا ہے جو کام انبیاے کرام علیہم السلام نے انجام دیا تھا۔ اس کی خاطر انھوں نے ہر قسم کی قربانی دی۔ وہ آگ میں ڈالے گئے، آروں

سے چیرے گئے، ان کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے، پتھر برسائے گئے، ان پر طرح طرح سے تشدد کیا گیا، جسموں کو داغا گیا، طعنے دیے گئے، تمسخر کا نشانہ بنایا گیا، تذلیل کی گئی، گھر سے بے گھر کر دیا گیا، مال واسباب سے محروم کر دیا گیا لیکن وہ اپنے مقام پر ثابت قدم رہے۔

پھر خیال آتا ہے کہ ہمارا گروہ تو وہ گروہ ہے، جو یہ عزم لے کر اٹھا ہے کہ ساری دنیا کو ایک اللہ کی بندگی کی طرف لے کر آنا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کام شیروں کے کرنے کا کام ہے۔ اگر چہ بہ ظاہر ہمارے دلوں میں کتنے ہی امراض کیوں نہ پیدا ہو چکے ہوں اور ہماری زندگیوں میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں، ہمیں یہ کام کرنا ہے۔ چناں چہ میں نے یہ سوچا کہ شاید یہ مناسب ہے کہ میں آپ کو عزیمت کی دعوت دوں، اس لیے کہ یہی راستہ شیروں کا راستہ ہے۔ ان لوگوں کا راستہ ہے جو دنیا کو بدلنے کا عزم لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور دنیا کو بدل ڈالتے ہیں۔ تاہم، جب میں نے بہ حیثیت مجموعی تحریک کا جائزہ لیا اور عزیمت کی کسوٹی پر پرکھا تو مجھے بڑی شرم آئی کہ میں اس مقام پر کھڑے ہو کر، یہ کہوں کہ آپ سب لوگ رخصت کی راہ چھوڑ کر عزیمت کا راستہ اختیار کریں۔

جب ہم دنیا اور خاص طور پر مسلم دنیا میں دین حق کا حال دیکھتے ہیں کہ مسلمان ایک ارب سے زائد ہونے کے باوجود عزت سے محروم اور ذلت سے ہم کنار ہیں اور خون مسلم پانی کی طرح ارزاں ہے۔ برسوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں، بے شمار افراد اس عزم کا اعلان کررہے ہیں کہ اللہ کے دین کی سربلندی ان کا مقصد زندگی ہے، یہ ان کی ساری تگ ودو کا نصب العین ہے اور اس کے باوجود کہ ان کے قدم آگے بڑھے ہیں، مگر وہ ابھی تک کام یابی سے ہم کنار نہیں ہوسکے ہیں۔ اسلام موجود ہے، اس کے نام لینے والے موجود ہیں، اس کے لیے تقریریں کرنے والے بہت ہیں، اس پر کتابوں کی نکاسی بھی کم نہیں ہے، لیکن ہر طرف اپنوں کی چیرہ دستی اور غیروں کی ریشہ دوانیوں سے پورا جسد مسلم زارزار اور فگار فگار ہے۔ ایسے میں، میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ گروہ، مختصر اور مٹھی بھر گروہ جوان حالات میں اس عزم کے ساتھ کھڑا ہوا ہے کہ اللہ کے دین کو زمین پر دوبارہ غلبہ اور عزت حاصل ہو، اور مسلمان قوم ایک بار پھر غلامی کی بہ جائے ہادی اور امام بن کر کھڑی ہوجائے، یہ وقت کا تقاضا بھی ہے اور عزیمت کی راہ بھی، لہٰذا اس کے لیے سوائے عزیمت اور عظمت کی راہ کے اور کوئی راہ نہیں ہے۔

جب میں نے اس بات کا فیصلہ کرلیا کہ رخصت کی بات کرنا آپ جیسے گروہ کے مناسب حال نہ ہوگا تو پھر میں نے یہ سوچا کہ میں عزیمت کی بات کس انداز اور کس پیرائے میں کروں؟ اس لیے کہ زمانہ بڑا نازک ہے، اور ہر طرف انسان اپنے آپ کو مشکلات کے اندر گھرا ہوا محسوس کرتا ہے، مصالحت اور مفاہمت کا دور دورہ ہے، قدم قدم پر ایسی پرکشش چیزیں ہیں جو نگاہ کو کھینچتی ہیں، جہاں قدم پھسلنے لگتے ہیں اور آدمی کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہیں بیٹھ جائے۔

سوال یہ ہے کہ رخصت کیا ہے اور عزیمت کیا ہے؟

اگر ایسا ہوتا کہ ہر بات بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوجاتی کہ یہ کرنا صحیح اور یہ کرنا غلط تو شاید زندگی بڑی آسان ہوجاتی۔ مثال کے طور پر روزمرہ زندگی کے حوالے سے یہ معلوم ہوجاتا کہ ٹیلی ویژن گھر میں رکھنا چاہیے یا نہیں رکھنا چاہیے، گھر میں قالین بچھانا صحیح ہے یا غلط، دبئی یا سعودی عرب کا رخ کرنا جائز ہے یا ناجائز، تو ترجیحات کے تعین میں بہت سارے لوگوں کے لیے فیصلہ آسان ہوتا۔ پھر یا تو وہ جان

بوجھ کر ایک ناجائز کام میں پڑتے، یا سوچ سمجھ کر اپنا نقصان گوارا کرتے اور ناجائز کام سے پرہیز کرتے۔

مشکل یہ ہے کہ زندگی اس قدر آسان نہیں ہے۔ زندگی ایک امتحان ہے اور اس میں رخصت وعزیمت، یعنی ترجیحات کا تعین ایک کڑا مرحلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امتحان کو اس عظیم الشان امتحان کو، جو اس نے مخصوص کر رکھا ہے، اور جس کے بارے میں اس نے کہا ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ جس کا خیال بھی انسان کے دل میں گزرا، اس کو اس نے اس طریقے سے دو الگ الگ راستے کر کے واضح نہیں کیا ہے، بلکہ حرام وحلال کے درمیان ایک وسیع میدان چھوڑ دیا ہے جس میں آدمی چاہے تو ادھر سے اُدھر نکل جائے، اور یہی محسوس کرتا رہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے اور اس کو خیال بھی نہ آئے کہ وہ غلط راستے پر چل پڑا ہے اور حرام کا مرتکب ہو رہا ہے۔ یہ وہ بیچ کا دائرہ ہے جہاں رخصت اور عزیمت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ رخصت و عزیمت میں اصل مسئلہ ترجیحات کے تعین کا ہی ہے۔

حلال، واضح طور پر حلال ہے اور جس کا واضح طور پر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی طرح حرام، واضح طور پر حرام ہے اور جس میں واضح طور پر کسی کام کو کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ اس حلال اور حرام کے درمیان بہت سے ایسے معاملات ہیں جن سے روزمرہ زندگی میں ہمیں واسطہ پڑتا ہے اور ان میں دوٹوک اور واضح ہدایات نہیں دی گئی ہیں بلکہ ترجیحات کی بنا پر ان کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ہم اس طرح کے بے شمار فیصلے کرتے ہیں کہ کیا کمائیں اور کہاں خرچ کریں، کہاں سچ بولیں اور کہاں جھوٹ، کہاں ہم رشوت دیں اور کہاں نہ دیں، کہاں حق کے لیے اپنا مال قربان کریں اور کس چیز کو کس چیز پر ترجیح دیں۔ یہ وہ پورا دائرہ کار ہے، جہاں پر حلال اور حرام کی بحث ختم ہو جاتی ہے، جہاں صحیح اور غلط کی واضح رائے کشادہ اور نمایاں نہیں رہتی، بلکہ ہم کو ترجیحات کا تعین کرنا پڑتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کسے اختیار کریں اور کسے نہ کریں۔ یہ وہ نازک مقام ہے جہاں فیصلہ دشوار بھی ہوتا ہے اور مشکل بھی۔

اللہ کے راستے پر چلنے کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں سیدھی سیدھی اللہ کی اطاعت کرنے کی کوشش کرے اور مسلمان بن کر رہنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔ بعض لوگوں کی نظر میں اتنا ہی ہو جائے تو کافی ہے۔

ایک بدو نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ سے پوچھا کہ میرے فرائض کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کلمہ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس نے کہا کہ بس۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بس۔ اس پر اس نے کہا کہ یہ میرے لیے کافی ہے اور وہ چلا گیا۔ اس کے لیے اتنا ہی اسلام کافی تھا۔

ایک اور شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے قرآن کریم کی تعلیم دیں۔ آپ ﷺ نے اسے سورۃ الزلزال پڑھانے کا حکم دیا۔ اس نے پوری سورہ پڑھی اور کہا کہ میں اس میں کوئی کمی بیشی نہ کروں گا اور یہ میرے لیے کافی ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ سیدھا سادا نسخہ بڑا آسان ہے، اور یہ بالکل ہمارے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر عمل درآمد کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ یہ ایک صاف اور واضح راہ ہے جس پر ہم بہ آسانی چل سکتے ہیں۔

یہیں سے رخصت اور عزیمت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ

اس کا کوئی حتمی معیار نہیں ہے۔ اس کے لیے دو اور دو چار کی طرح کوئی اصول نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کے لیے اس کا معیار الگ ہوگا۔ ہر ایک کو اپنا انفرادی فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کس راہ پر چلنا چاہتا ہے۔ ہر ایک سے مطالبہ بھی الگ ہوگا، اور ہر ایک کا حساب بھی الگ ہوگا اور جزا و سزا بھی الگ الگ ہوگی۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ آدمی نماز روزہ، زکوٰۃ اور حج کا اہتمام کرے بلکہ اس کا تقاضا دعوت اور جہاد بھی ہے۔ اس کا تقاضا وہ کام بھی ہے، جو انبیاے کرام علیہم السلام نے سرانجام دیا۔ اس کے نتیجے میں ہم وہ سارے کام کرتے ہیں جن کی دعوت ہم اقامت دین، شہادت حق اور اسلامی نظام کے قیام کے الفاظ سے دیتے ہیں۔ اب، جب کہ ہمارا تعلق اس گروہ سے ہے جو اگرچہ تعداد میں کم ہے، تاہم اس نے اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے اور اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اللہ کی زمین پر غالب کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جو حدود ہوں گی، وہ شاید اس بدو سے مختلف ہو، جس کے لیے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر قناعت کرنا کافی قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا قانون بتا دیا ہے کہ جو شخص دین کا علم لے کر کھڑا ہو، دین کا جھنڈا اٹھائے، شہادت حق کا نعرہ بلند کرے اور اقامت دین کا دعویٰ کرے، اس کو ٹھنڈے پیٹوں اس راہ سے گزرنے نہیں دیا جائے گا۔ اس کی آزمایش بڑی سخت ہوگی۔ اس کے سامنے صبح سے شام تک بے شمار انتخاب کے مواقع آئیں گے۔ لمحہ لمحہ اس کا امتحان ہوگا، اس کو جان ایک دفعہ نہیں دینا پڑے گی بلکہ روز جینا اور روز مرنا ہوگا۔ ایک دفعہ مرنا تو شاید آسان ہو لیکن روز روز مرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ موت صرف جسم سے جان کے نکل جانے کا نام نہیں ہے، بلکہ اپنی خواہش، اپنی آرزو اور اپنی تمنا کو مارنا بھی موت کی ایک صورت ہے۔ آخر انسان عبارت کس چیز سے ہے؟ ہڈیوں اور گوشت سے نہیں بلکہ ان آرزوؤں اور تمناؤں سے، جو اس کے دل و دماغ کے اندر بستی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کے بغیر راہ حق، دعوت اور جہاد کی منزل طے نہیں ہو سکتی۔

اس بات کو واضح طور پر قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ (العنکبوت:۲)

”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ
”ہم ایمان لائے“ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟“

ذرا انداز بیان پر غور کیجیے۔ ذکر ان کا ہو رہا ہے جو مٹھی بھر لوگ مکے میں ایک اللہ کے اوپر ایمان لے کر آئے ہیں، جو خدا سے محبت کرتے ہیں اور خدا ان سے محبت کرتا ہے، لیکن لہجے میں بڑی اجنبیت ہے اور بڑی غیریت ہے کہ کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد انھیں آزمایا نہ جائے گا۔ حالاں کہ یہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے جسم و جان کا سودا کر کے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا کہ میرے بندے یہ سمجھ بیٹھے ہیں، بلکہ یوں کہا گیا ہے کہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ گویا ایمان لانے کے بعد ہر ایک کو آزمایش کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔

ایمان کا دعویٰ ہوگا تو آزمایا بھی ضرور جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں جب تک کہ برے کو بھلے سے الگ نہ کر دیا جائے۔ ایک مقام پر قرآن مجید نے اس طرف یوں اشارہ کیا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (آل عمران:۱۷۹)

”اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا، جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔“

گویا اس وقت تک کام یابی سے ہم کنار ہونا ممکن نہیں ہے جب تک برے اور بھلے کی تمیز نہ ہو جائے۔ یہ اس لیے کہ زبان سے دعویٰ کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں، لوگ بہت سے لبادے اوڑھ لیتے ہیں، بہ ظاہر شیر نظر آتے ہیں، لیکن کس کے سینے میں واقعی شیر کا دل ہے، اور کون اتنی ہمت اور جرأت رکھتا ہے کہ نہ صرف حلال و حرام کی پابندی کرے، بلکہ آگے بڑھ کر ان جائز اور حلال چیزوں کو بھی چھوڑ دے کہ جن کی قربانی راہ حق میں چلنے کے لیے ناگزیر ہو۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی آزمائش ضروری ہے، جس کے لیے وہ ہلا ڈالے جائیں گے، جس کے لیے انھیں جھنجھوڑا جائے گا، آروں سے چیرے جائیں گے، زندہ زمین کے اندر گاڑے جائیں گے اور ان کا

گوشت لوہے کی کنگھیوں سے نوچا جائے گا۔ یہ سب کس لیے ہے، اس لیے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام یعنی عدل و انصاف کا نظام قائم ہو۔

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کے یہ واقعے کو تازہ کیجیے۔ جو بات حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی تھی کہ تم دیکھنا کہ ایک روز یہ دین غالب آ کر رہے گا، اس بات پر اگر غور کیا جائے تو اس میں بڑی گہری حکمت نظر آئے گی۔ آج ہم بھی اسی دین کو قائم کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے پیش نظر بھی نبی کریم ﷺ کا وہی مشن ہے، جسے لے کر آپ ﷺ آگے بڑھے۔ البتہ یہ کام صرف چند افراد کی تبدیلی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ خدائی عدل کے قیام کا نام ہے۔

ایک انسان کے کردار اور کریکٹر کے لیے اس سے بڑی کوئی آزمایش نہیں ہے کہ وہ اختیار اور اقتدار کا مالک ہو۔ دوسری طرف انسان کا یہ حال ہے کہ اگر کہیں اس کو اختیار مل جائے، خواہ اختیار گھر میں مل جائے یا کہیں اور تو وہ فوراً پھسلنے لگتا ہے اور آپے سے باہر ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے پیش نظر قیادت و امانت کے لیے اگر کوئی معیار ہے تو وہ بہترین صاحب کردار لوگ ہیں۔

اسلام کا نام لینے والے ہمیشہ بہت رہیں گے، لیکن اسلام کے نام لیواؤں اور اسلام کے مدعیوں کو اقتدار اس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ آزمایش کی بھٹی میں تپ کے اور عزیمت کی راہ پر چل کر، کھرا سونا نہ بن جائیں، جن پر یہ اعتماد کیا جاسکے کہ جب ان کے ہاتھ میں اختیار اور اقتدار آئے گا، تو وہ اللہ کے بندوں کی خدمت کریں گے، نہ کہ انسانوں کے خدا بن جائیں گے۔ دراصل صبر، قربانی اور آزمایش کے فلسفے کی حقیقت یہی ہے۔

آپ سوچیں گے کہ عزیمت کی بات کرتے کرتے اچانک صبر کا لفظ کہاں سے آگیا، اور میں نے اچانک قربانی کا لفظ کیوں بول دیا؟ اگر غور کیا جائے تو یہ تینوں چیزیں ایک ہی ہیں اور تینوں کے معنی بھی ایک ہیں۔

صبر کے معنی بہ ظاہر یہی ہیں کہ مصیبت پڑے تو برداشت کا مظاہرہ کیا جائے، لیکن یہ صبر کے منفی (Negative) معنی ہیں۔ صبر کے مثبت (Positive) معنی یہ ہیں کہ ہم آگے بڑھ کر وہ کام کریں، جس کے لیے ہم اپنی جان، اپنا مال، اپنا

وقت اور احساسات و جذبات اور ترجیحات کی قربانی دے سکیں۔ جب اس قسم کا صبر پیدا ہو جائے، تب کہیں جا کر اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے پورے ہوتے ہیں جو اس نے دنیا اور آخرت میں سر بلندی کے لیے کر رکھے ہیں۔

آیئے ہم اس کا تفصیل سے جائزہ لیں، کہ یہ عزیمت کا راستہ کون سا راستہ ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں ہیں جو ہم کو پیش آسکتی ہیں، جن کے لیے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیے۔

سب سے پہلا معاملہ دنیا اور مال کا ہے۔ مال کمانا اور خرچ کرنا، اس کے گرد ہماری زندگی کا بڑا حصہ گھومتا ہے۔ اسی کے لیے ہم بڑی جد و جہد اور محنت کرتے ہیں۔ دنیا میں مال کمانے کے لیے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خاص طور پر اگر آدمی یہ چاہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے۔ ایک حدیث میں جو کہ دجال کے بارے میں ہے، کہا گیا ہے کہ اس کے ساتھ ایک جہنم ہوگی اور ایک جنت۔ جو دجال پر ایمان لائے گا وہ اس کی جنت میں داخل ہوگا اور جو خدا پر ایمان لائے گا وہ اس کی جہنم

میں داخل ہوگا۔ بات یہ ہے کہ ایک خدا پر ایمان لانا، آج کی دنیا میں جہنم میں داخل ہونے کے مترادف ہے اور یہ بات سب سے زیادہ مال کمانے کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مال کمانے کی اجازت دی ہے اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پورا کرنے کا بھی حکم ہے، لیکن جو آدمی دعوت حق کے کام کے لیے کھڑا ہوا ہو، آخر اس کو اس سے زیادہ مال سے دلچسپی کیوں ہو جو اس کی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے کافی ہو۔ جو لوگ مال کمار ہے ہیں ان کی تعداد دنیا کے اندر ایک، دو نہیں، کروڑوں نہیں بلکہ اربوں میں ہے، جن کا صبح سے شام تک بس یہی کام ہے کہ مال کیسے کمائیں۔ وہ صرف یہ سوچتے ہیں کہ ہم کتنا کمائیں اور کہاں جمع کریں، کہاں لگائیں اور کہاں خرچ کریں اور اس پر ہمیں کتنے فی صد نفع ہوگا۔

اس کے مقابلے میں ایک ارب، ایک کروڑ یا ایک لاکھ مسلمان نہیں، بلکہ صرف دس پندرہ ہزار آدمی جو اللہ کی زمین پر اللہ کی بندگی کا عزم لے کر کھڑے ہوئے ہوں، اگر وہ بھی یہی سوچنا شروع کر دیں کہ کیسے زیادہ سے زیادہ کمائیں اور کیسے اس کو جمع کریں اور کہاں اس کو لگائیں کہ زیادہ سے زیادہ کما سکیں، جائداد اور بنک بیلنس

بنانے کی فکر ان کے دامن گیر ہو جائے، تو ایسے آدمیوں کو کیسے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی کام یابیوں سے سرفراز کرے۔ یہ کام تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو جائز ذرائع سے مال کمانے میں صرف اس قدر دلچسپی ہو، جو ضروری اور ناگزیر ہو، جس سے ان کی ضروریات زندگی پوری ہو جائیں۔

خرچ کرنے میں بھی صرف اسی پر اکتفا نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی زکوٰۃ ادا کر دے، یا اپنی ساری ضروریات زندگی اور سارے شوق پورا کرنے کے بعد تحریک اسلامی کے بیت المال کے لیے ایک ماہوار رقم مقرر کر لے۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے قرآن وحدیث سے اس سے بڑھ کر کوئی ذمے داری ثابت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ معاملہ قرآن وحدیث کے احکامات کا نہیں ہے، بلکہ قرآن وحدیث کے منشا اور اس کی روح کا ہے۔

عام مسلمانوں اور خدا کی بندگی کرنے والوں کے لیے، شاید یہ بات صحیح ہو کہ زکوٰۃ دے دیں اور راہ خدا میں ایک ماہوار رقم اپنی آمدنی سے باندھ لیں، اور اس رقم کے تناسب کا کوئی مقابلہ اس خرچ سے نہ کریں کہ جو وہ اپنی ضروریات زندگی پر کرتے ہیں۔

بہ ہر حال جب ایک مخصوص رقم ماہوار کی باندھ لی اور یہ زندگی کا ایک اپارٹمنٹ ہے جو ہم نے الگ کردیا، اب اس کے علاوہ ہماری آمدنی ہماری اپنی ہے، وہ ہم چاہیں تو مہینے میں چار پانچ سو کا پان کھائیں، سگریٹ پییں، کہیں ہوٹل میں چلے جائیں اور دو چار سو خرچ کرڈالیں، ہمیں اس کا کوئی دکھ نہ ہوگا۔ اگر کوئی مانگنے کے لیے آجائے تو کہیں کہ کل ہی تو چندہ لے کر گئے تھے، آج پھر آگئے ہو، آخر ہم کہاں تک دیتے رہیں۔ اگر آدمی ضرورت سے زیادہ نہ کمائے اور ضرورت سے زیادہ کمانے کے لیے کوئی ناجائز کام نہ کرے، تو خرچ کرنے کا سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے اور خرچ کرنے میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ خرچ کرنے کے حوالے سے ہمارا ایمان اور یقین کس قدر مضبوط ہے۔

عزیمت کا راستہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنا مال خدا کی راہ میں دونوں ہاتھوں سے لٹائے اور اس کو یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر احسان ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی، نہ کہ میں نے دین پر یا تحریک اسلامی اور جماعت پر کوئی احسان کیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ لوگ جو اللہ کے دین کو قائم کرنے کا عزم اور اعلان دن رات کرتے ہیں، جو صبح شام اس کا وظیفہ پڑھتے ہیں اور بے چین ہوکر پوچھتے ہیں کہ

وہ گھڑی کب آئے گی جب اسلامی نظام قائم ہوگا، اگر ان کی اکثریت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی آمدنی کا بہت کم حصہ ایسا ہے جو راہ خدا یا تحریک کے لیے صرف ہوتا ہے۔ خدا میری اس بدگمانی کو معاف فرمائے، لیکن جہاں تک میرا علم ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنے مال کا بہت کم حصہ ہے جو ہم نے خدا کی راہ کے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا حق ادا ہو گیا ہے۔

میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کا علَم بلند کیے ہوئے ہیں، اگر ان کو کہا جائے کہ ہم آپ کو ایسی جگہ پیسہ لگانے کی دعوت دیتے ہیں، جس میں ایک کے سات سو گنا سے ایک ہزار گنا تک ہو جائیں گے اور ایسے وقت آپ کو ملے گا، جب کہ واقعی آپ کو اس کی ضرورت ہوگی، تو ان کی جیب مشکل سے کھلتی ہے۔ جب ہم ان سے کہیں کہ فلاں جگہ زمین بک رہی ہے، اس کو اگر آج خرید لیا جائے تو کل اس کے دگنے روپے ملیں گے تو وہ جانتے ہیں کہ نہ زمین ان کے ساتھ جائے گی اور نہ اس کی دوگنی آمدنی ساتھ جائے گی، آخر دو گز زمین ہی ان کو ملے گی، لیکن وہ دوڑ کر اس کے لیے پیسہ نکالتے ہیں۔ اگر تحریک کو مالی وسائل کی ضرورت ہو تو مشکل سے چند سو

روپیہ نکلتا ہے، دوسری طرف گھر میں اگر قالین ڈالنا ہو یا عالی شان پردے لگانا ہو، یا ماربل کے مکان بنانے ہوں، تو جیب ختم ہی نہیں ہوتی۔لٰہذا عزیمت کا راستہ تو یہ ہے کہ ہم دل کھول کر راہ خدا اور تحریک پر خرچ کریں۔ اگر چہ قرآن وسنت سے ایک مخصوص رقم صرف کرنے کو شاید کوئی حرام نہ کہہ سکے، لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا اس روش اور طرز عمل پر جو عموماً ہم نے اپنا رکھا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کام یابی کے انعام سے سرفراز کرنے والا ہے؟

اسی طرح معیار زندگی کا معاملہ ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ زندگی بسر کرتے ہوئے جہاں گہری خندقیں آجائیں اور اونچے پہاڑ آجائیں، وہاں پر آدمی کے لیے بچ کے چلنا بڑا آسان ہوتا ہے۔آدمی بہ آسانی دیکھ لیتا ہے کہ یہ پہاڑ میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کرے گا، میں اس سے بچ کر نکل جاؤں۔مگر زندگی کا سفر ان راستوں پر بڑا خطرناک ہوتا ہے جو بہ ظاہر بڑے سیدھے اور صاف دکھائی دیتے ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ پاؤں پھسلنے کے امکانات ہوتے ہیں۔کہیں کوئی کیلے کا

چھلکا پڑا ہے، کہیں کوئی چھوٹا سا کھڈا ہے، مگر آدمی اطمینان کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور اچانک اس کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ گر پڑتا ہے۔ کسی چھوٹے سے پتھر سے ٹکراتا ہے اور زخمی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ منافق وہ ہے جو چھوٹے گناہوں کو حقیر جانتا ہے اور مومن وہ ہے جو چھوٹے گناہوں کو بھی بہت بڑا خیال کرتا ہے۔ یہ گناہوں کے ارتکاب کا مسئلہ نہیں ہے، وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ یہ تو احساس کی بات ہے۔

ایک مومن سے گناہ بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ ایک مومن زانی بھی ہو سکتا ہے، چوری بھی کر سکتا ہے اور بہت سے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ مگر ایک مومن اور منافق کے طرز عمل میں فرق ہوتا ہے۔ منافق کی نظر میں چوں کہ معمولی گناہوں یا چھوٹی چھوٹی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، اس لیے وہ خیال کرتا ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر ایک مومن چوکس و چوکنا ہوتا ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ میں جگہ جگہ کھائیاں ہیں، جو بہ ظاہر نظر نہیں آتیں، جگہ جگہ دشمن گھات لگائے بیٹھا ہوا ہے جو برابر کہیں نہ کہیں نقب لگائے گا، داؤ مارے گا، کہیں پھندا پھینکے گا، اور مجھے گرا لے گا اور

پھانس لے گا، راستے سے ہٹا دے گا اور تباہ و برباد کر دے گا۔ اس لیے وہ ہر وقت چوکنا رہتا ہے، معمولی باتوں کو بھی اہمیت دیتا ہے اور انھیں نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ چند مثالوں سے اس بات کو سمجھئے۔

ٹیلی ویژن کی مثال لے لیجیے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ خرابی کی جڑ ہے۔ پھر میں اس پر کیوں ہزاروں روپے برباد کروں۔ اس سے کسی غریب ساتھی کی مدد ہو سکتی ہے، یہ کسی اور مفید کام میں لگ سکتا ہے، کتابیں خرید کر دی جا سکتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جن دنوں میں ڈھاکہ رہتا تھا، میرے پاس کوئی ٹیلی ویژن سیٹ نہیں تھا۔ اس کے بعد میں انگلینڈ پہنچا، وہاں کوئی گھرانہ ٹی وی سے خالی نہیں ہوتا۔ میرے اچھے اچھے مسلمان دوستوں نے کہا کہ اپنے بچوں کی انگریزی بہتر بنانے کے لیے ٹی وی خرید لو اور کچھ نہیں کم سے کم نیوز ہی سن لیا کریں گے۔ میں تین سال تک برابر اس حال میں رہا کہ میں نے اس سے انکار کیا۔ اس کے بعد ایران میں انقلاب آ گیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ آج ٹی وی پر یہ آیا، وہ آیا، یہ دکھایا گیا، انقلاب کی یہ لہر اٹھ رہی ہے،

تو سب گھر والوں نے جمع ہو کر یہ سوچا کہ اس انقلاب کو دیکھنے کے لیے تو کم از کم ٹی وی خرید لینا چاہیے۔ چناں چہ ہم نے سیکنڈ ہینڈ ٹی وی اپنے گھر کے لیے خرید لیا۔ مگر مجھے آج بھی اس پر شرمندگی ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا یہ راہ واقعی بڑی خطرناک ہے۔ اگرچہ میرے بچے سوائے اسپورٹس اور نیوز کے کچھ نہیں دیکھتے، مگر میرا ضمیر اس بوجھ سے آج تک آزاد نہیں ہو سکا۔

میں نے یہ مثال اس لیے دی ہے کہ یہ راہ بڑی خطرناک راہ ہے۔ شیطان پوری کوشش کرتا ہے کہ آدمی کسی طرح پھسل جائے۔ مین یہ نہیں کہتا کہ ٹی وی کوئی غلط چیز ہے لیکن جن لوگوں نے عزیمت کی راہ پر چلنے کا دعویٰ کیا ہو، اور اس راہ پر چل پڑے ہوں، ان کو آخر اس کے لیے وقت کہاں سے مل سکتا ہے کہ وہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں اور اس میں اپنا وقت لگائیں۔

ایک ایک لمحے کا حساب اللہ کو دینا ہے، ایک ایک لمحہ دعوت کے کام میں صرف ہونا چاہیے۔ محلے کے ساتھی اور بیوی بچے قیامت کے روز گریبان پکڑ کر

کھڑے ہو جائیں گے، اگر آپ نے ان تک اللہ کا پیغام نہ پہنچایا۔ وہ پوچھیں گے کہ ہم جہنم کی راہ پر سفر کرتے رہے اور تم ٹی وی دیکھتے رہے۔ اب بتاؤ ہمارے اس انجام کا ذمہ دار کون ہے، تم یا ہم؟ شاید ہم اس کا جواب نہیں دے سکیں گے۔

آپ کو وہ واقعہ یاد ہو گا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا کہ تم مجھے قرآن سناؤ، تو انھوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ قرآن تو آپؐ پر نازل ہوتا ہے، میں آپؐ کو قرآن کیسے سناؤں؟ آپؐ نے کہا: ہاں، میں تم ہی سے سننا چاہتا ہوں۔ انھوں نے سورۃ النساء کے ایک حصے کی تلاوت کی اور جب اس آیت پر پہنچے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا۝ (آیت:۴۱) ’’اس وقت کیا کیفیت ہو گی جب ہم ہر قوم میں سے ایک گواہ بنا کر لائیں گے اور تم کو ان سب پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے کہ آیا تم نے ان تک پیغام پہنچایا یا نہیں؟‘‘ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو نبی کریم ﷺ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔

یہ کیا چیز تھی؟ ایک لمحے کے لیے آپ سوچیں، یہ ذمے داری کا احساس تھا کہ اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر صرف اپنے اعمال کی جواب دہی ہی نہیں کرنا، بلکہ سارے انسانوں کی زندگی اور سارے انسانوں کے اعمال کی جواب دہی میرے ذمے ہے۔ یہ وہ احساس تھا کہ جس سے نبی کریم ﷺ جنھوں نے اس شہادت کے فریضے کو سب سے بڑھ کر سرانجام دیا، ان کا قلب بھی پگھل کر رہ گیا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جس کے سامنے ذمے داری کا یہ احساس ہو، وہ جائز اور ناجائز کی بحث میں کہاں پڑ سکتا ہے۔ اس کو تو یہ سوچنا ہے کہ یہی واحد مقصد زندگی ہے۔ ایک ہی راہ ہے جس پر مجھے چلنا ہے، ایک ہی منزل ہے جو مجھے سر کرنا ہے۔ اس راہ میں جو چیز رکاوٹ ہو، خواہ اس کی اجازت ہو یا نہ ہو، خواہ جائز ہو یا ناجائز، مجھے اس سے دامن بچا کر آگے نکلنا ہے۔

یہ بھی عزیمت ہے کہ جب احساسات و جذبات، غصہ اور محبت و نفرت پر زد پڑے تو انسان صبر کرے۔ قرآن مجید میں بار بار کہا گیا ہے کہ: فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (قٓ:۳۹) ''اے نبی ﷺ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو۔'' آج

بھی تحریک سے وابستہ لوگوں کو طرح طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔کوئی کہتا ہے کہ یہ لوگ کم زور ہیں، کوئی کہتا ہے کہ متشدد ہیں، تشدد پر اتر آتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ غنڈے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ سیاسی طور پر ناکام ہیں، کوئی کہتا ہے کہ زیادہ سیاسی ہو گئے ہیں اب دینی نہیں رہے، کوئی کہتا ہے کہ مُلّا ہیں ان کو دنیا نہیں چلانی آتی۔ان ساری باتوں کے لیے بڑی عزیمت کی ضرورت ہے کہ آدمی ان سب کو سنے اور پی جائے اور اس کے بعد اپنے راستے کے اوپر استقامت کے ساتھ چلتا رہے۔

اس سے بھی بڑھ کر جس عزیمت کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی برائی کا جواب بھلائی سے دے سکے، گالیاں سن کر بھی دعا دے سکے، کانٹوں پر چل کر بھی پھول نچھاور کر سکے۔قرآن نے اس طرز عمل اور روش کو اپنانے کو کہا ہے کہ اس کے نتیجے میں تمھارے کٹر دشمن بھی گہرے دوست بن جائیں گے، لیکن یہ کام معمولی کام نہیں ہے۔یہ صفت ان کے حصے میں آتی ہے جو بڑے حوصلے والے ہیں، جو بڑے صبر کرنے والے ہیں، جن کے اندر عزیمت پوری کی پوری موجود ہو۔

میں نے عزیمت کے چند پہلو آپ کے سامنے گنوائے ہیں۔اصل بات جو

میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عزیمت کا راستہ اسی وقت آسان ہوسکتا ہے جب کبھی آپ کچھ وقت نکال کر اور رات کی تنہائی میں ایک دفعہ بیٹھ کر اس کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ جسے آپ مقصد زندگی قرار دیتے ہیں، کیا وہ آپ کے دل کے اندر بھی وہی مقام رکھتا ہے؟ اس لیے کہ مقصد زندگی تو وہ ہوتا ہے جس کی محبت آدمی کے دل کے اندر بیٹھ چکی ہو، جس کی خاطر وہ پوری زندگی وقف کرنے کے لیے تیار ہو۔ پھر وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کی اجازت بھی ہے کہ نہیں۔ پھر تو وہ یہ سوچتا ہے کہ میرے وقت کا ہر لمحہ، میرے مال کا ہر پیسہ، میری تمام صلاحیتیں اور وسائل، میری ہر چیز اللہ کی راہ میں اور اس کی مرضی کے مطابق کھپنا چاہیے۔

ایک اور بات بھی غور کرنے کی ہے، وہ یہ کہ جب سختیاں ہوں، آزمائش ہو، مشکلات پیش آئیں تو آدمی کے لیے جم جانا اور ڈٹ جانا بہت آسان ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخالفتوں کے طوفان کے آگے لوگ پامردی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ راستے جن کا ابھی میں نے ذکر کیا جو بہ ظاہر بڑے صاف اور سیدھے نظر آتے ہیں، لیکن جن میں چھوٹے چھوٹے پیچ وخم ہوتے ہیں، جن میں جگہ جگہ قدم پھسلنے کا سامان ہوتا ہے، وہ خطرناک راستے ہوتے ہیں۔

ایک خطرناک راستہ وہ بھی ہوتا ہے، جہاں پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمانے لگتا ہے، جہاں سختی سے نہیں بلکہ نعمت سے آزمانے لگتا ہے۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کو اتنے کوڑے مارے گئے کہ کوئی ہاتھی بھی ان کو برداشت نہ کرسکتا، مگر وہ مسکراتے ہوئے اور جواں مردی سے اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب خلیفہ بدلا اور اس نے ان کی خدمت میں دولت اور دینار کی تھیلیاں بھیجیں، تو وہ کانپ اٹھے اور انھوں نے کہا کہ اب زیادہ کڑی آزمایش آگئی۔ انھوں نے فوراً سارا کا سارا مال واپس کردیا۔

دراصل رخصت اور عزیمت کی یہ ساری بحث بڑی مختصر ہے۔ اگر آپ کوئی بڑا کام کرنے چلے ہیں اور آپ کے سامنے پوری دنیا کی نئی تعمیر کا ایک نقشہ ہے، اگر آپ پورے ملک کا نظام بدلنا چاہتے ہیں، تو یہ وہ کام ہے جو عزیمت کا راستہ اختیار کیے بغیر نہیں ہوسکتا۔ سر کے بل جانا پڑے گا، نقد جان بھی گنوانا پڑے گی، جیب بھی خالی کرنی پڑے گی، تن کے کپڑے بھی دینے پڑیں گے، تب جا کر کہیں شاید وہ منزل آئے کہ

جب یہ ملک اسلامی انقلاب سے ہم کنار ہو۔ اگر یہ کام صرف تبلیغی اور اصلاحی کام ہے، ایک گروہ کو منظم کرنا ہے، تھوڑے بہت نعرے لگانا ہیں، تو یہ کام ساٹھ سال سے ہوتا آیا ہے، اور ساٹھ سال اور بھی ہوتا رہے گا، مگر اس سے معاشرے کے مجموعی اقتدار کے سرچشموں پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کو تو وہ لوگ چاہییں جن کے بارے میں کہا گیا ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۙ (الاحزاب: ۲۳)

''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

یہ عہد صرف جائز سے فائدہ اٹھانے، اور حلال اور جائز کام کرنے اور حرام کاموں سے بچنے کا عہد نہیں تھا بلکہ یہ اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینے کا عہد تھا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (التوبہ:۱۱۱)

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔“

یہ سودا عزیمت کا سودا ہے، رخصت کا نہیں۔ اس سودے میں جان بھی کھپانی ہے اور مال بھی۔ جب آپ نے اس سودے کو سچ کر دکھایا، اس معاہدے میں جو آپ کا حصہ اور کردار ہے پورا کر دیا، تو سب سے زیادہ سچا وعدہ کرنے والا بھی اپنا وعدہ پورا کر دکھائے گا۔